عزاداران حسینؑ کے نام

ایام عزا اقدام و عمل کے دن ہیں

مولانا سید رضی الدین حیدر صاحب بانیٔ یادگار حسینی انٹر کالج، الہ آباد

عزیزان محترم! یہ محرم کا زمانہ ہے۔ مکروہات دنیا سے فی الجملہ لگاؤ کم ہوگیا ہے۔ دنیا طلبی اور اغراض ذاتی کے تاریک بادل چھٹ گئے ہیں اور حق وصداقت کی راہ کی لازوال قربانی کا نور اپنی پوری تابندگی کے ساتھ ہر طرف پھیلا ہوا ہے آسمان وزمین، اطراف وجوانب، فضا ماحول، گھر باہر سب غم سے معمور نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جب دل متاثر ہوتا ہے تو ساری دنیا اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے۔ عزائے حسینؑ ایک کائناتی اثر ہے جو منظم کوششوں اور مکمل سازشوں کے باوجود آج تک نہ مٹایا جاسکا بلکہ الٹی تدبیروں سے اس کے مظاہرات میں ہمیشہ ندرت وجدت ہی پیدا ہوتی رہی۔ بات یہ ہے کہ جو غم خارجی ماحول سے پیدا ہوتے ہیں وہ خارجی معالجے سے دور بھی ہوجاتے ہیں مگر جو خلش، جو تڑپ انسان کے بطون نفس کی گہرائیوں سے فطری طور پر اُبھرتی ہے اس کا دور کرنا بہت مشکل ہے۔ اگر یہ ضد کی جائے کہ جسم کے اندر دوڑتے ہوئے خون کی مضطرب لہروں اور سینہ کے اندر دھڑکتے ہوئے دل کی حرکت مسلسل کو قرار وسکون مل جائے تو ایسی بات مضحکہ خیز ہوگی اور ایسے شخص کو عقل سے خارج سمجھا جائے گا۔ اس لئے کہ اس مطالبہ میں حیات کے اس بنیادی اساس ہی پر ضرب لگ رہی ہے جس کے بغیر حیات حیات نہیں۔ واقعۂ کربلا پیکر انسانیت میں اسی دوڑتے ہوئے خون اور دھڑکتے ہوئے دل کی جگہ پر ہے جو ہماری حقیقی وانسانی حیات کا ضامن ہے جب تک اس زمین پر ایک انسان بھی باقی رہ جائے گا وہ اس متاع گراں کو ہمیشہ سینہ سے لگائے رہے گا۔

غموں کی دنیا میں غمِ حسینؑ کی اہمیت

انسان اور غم کا ازل سے ساتھ ہے اس کے باہمی ربط پر ہر بڑے شاعر، فلسفی اور مفکر نے مختلف عنوانات سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اتنا کچھ کہا ہے کہ اب مزید کسی اضافہ کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی، یہ زندگی غموں کا مجموعہ ہے ایسا مجموعہ جس میں کوفت بھی ہے اور کیف بھی، حزن بھی ہے اور سرور بھی اور جس سے اثر اندوز اور لذت کوش ہونے کا نام ہے حیات۔ ہر انسان کسی نہ کسی غم میں ضرور مبتلا ہے۔ غم کائنات ہو یا غم حیات، غم روزگار ہو یا غم عشق، غم مال ومنصب ہو یا غم آل واولاد، غم عیش ہو یا غم عمر رفتہ وغیرہ وغیرہ! ان میں ہر غم ایسا ہے جو انسان کی رگ حیات سے جونک کی طرح چمٹا ہوا اس کا خون چوس رہا ہے۔ غموں کی اس آباد دنیا میں غم حسینؑ بھی ایک غم ہے لیکن اس کی حیثیت الگ ہے۔ اس کا انداز جدا ہے۔ اس کے اثرات اور ہیں اور اس کے

نتائج سب سے مختلف ہیں، دنیا کا ہر غم ہمارے ہی خون پر پل رہا ہے۔ ہر لمحہ ہماری حیات مٹ رہی ہے اور غم پر شباب آ رہا ہے لیکن یہ غم حسینؑ فیضان رحمت کا ایک سرچشمہ ہے جہاں زندگی کے پیاسے آب حیات پی پی کر ابدی سیرابی حاصل کر رہے ہیں۔ یہ غم ہم سے کچھ نہیں مانگتا بلکہ اس کی بارگاہ عطا سے کمال اخلاق اور شرف انسانی کا خون صالح ہمارے مردہ دلوں میں دوڑایا جاتا ہے۔ جمود و بے حسی کا رنگ اور دنیا طلبی و نفس پرستی کا میل اسی سے دور ہوتا ہے۔ اس غم کا دوسرا نام ہے انسانیت اور اس کے مظاہرے کو کہتے ہیں عزاداری، جو اس واقعہ ہائلہ کے فوراً بعد سے شروع ہو کر مختلف ادوار سے گذرتی ہوئی ہمارے زمانہ تک پہنچی ہے۔ اب یہ آپ کو اختیار ہے چاہے اسے تاریخ انسانیت کے نام سے پکاریں اور چاہے تاریخ عزاداری کہیں۔ مگر کتنے افسوس کا مقام ہے کہ ایک مفید اور حیات بخش ذریعہ صرف رسمیات کی چہار دیواری میں اسیر ہو کر رہ گیا ہے اور اس سے ہم نے وہ اثرات حاصل نہیں کئے جن سے علمی و عملی طور پر ایوان حیات کے سارے کنگرے چمکنے لگتے!

ایک مفید تجویز

کچھ عرصہ ہوا ڈاکٹر علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامونپوری نے تاریخ عزاداری کی ترتیب و تدوین کی طرف ارباب ملت کو توجہ دلائی تھی اور یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں اس کام کے لئے کوئی ایک بندۂ خدا تیار ہو جائے اور معلومات کا ذخیرہ بھی فراہم کر لے جسے بعد میں مختلف عنوانات کے تحت سلیقہ سے صرف کیا جا سکے تو اس طرح شیعہ اور تاریخ عزاداری کا کام بیک وقت بہت آسانی سے ترتیب پا جائے گا اور پھر وہ کمی دور ہو جائے گی جو مدتوں سے دلوں میں چٹکیاں لے رہی ہے۔

آج دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی اور پست سے پست اقوام نے اپنی قومی تاریخ کی ترتیب کا کام ختم کر لیا ہے۔ جن کے یہاں تاریخی معلومات کا کوئی ذخیرہ نہ تھا انھوں نے اپنے مفروضہ روایتی افسانوں اور مروجہ مذہبی رسوم کی بنیاد پر اپنی قومی تاریخ کی پوری عمارت کھڑی کر دی ہے۔ مگر وہ قوم جو نہ صرف ہر دور میں تاریخ کی تدریجی رفتار کے ہم عنان رہی ہے بلکہ کبھی کبھی تاریخی عوامل کا ایک قومی جز بن کر اس کے راستے معین کرتی رہی ہے آج اپنی بے حسی اور غیر دانشمندی کی وجہ سے داستان پارینہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ تاریخ عالم نے افسانہائے کہن تک کو اپنے دامن میں جگہ دے رکھی ہے مگر اس قوم کے کسی کارنامہ کو من حیث القوم کوئی مقام عطا نہیں ہوا ہے۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو حیات کا وہ کون سا شعبہ ہے جو اس مردہ قوم کی بے لوث آبیاری سے لہلہا نہیں رہا ہے۔ یہ الگ ایک مستقل موضوع ہے۔ بڑا وسیع و طویل کہ قوم شیعہ کا ارتقائے علوم و فنون اور دنیا کی عام رفتار ترقی میں کتنا حصہ ہے مگر مورخ کا قلم اس موقف پر پہنچ کر رک جاتا ہے اور وہ بڑی ہوشیاری سے دامن بچا کر گذرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی مجبوری لاحق ہو گئی اور کسی کا ذکر ناگزیر ہو گیا تو وہ بس رواداری کے ساتھ ایک انفرادی نتیجہ عمل کے طور پر بیان کر دیا جاتا ہے کچھ ہی دن ہوئے مشاہیر اہل قلم ادیب و شاعر و فلسفی کو غیر شیعہ ثابت

کرنے کی مہم چلائی گئی تھی تحقیق وتحریر پر پورا زور قلم صرف کیا جا رہا تھا مگر یہ سعی نامشکور رہی اور یہ کوشش آپ اپنی فطری موت مرگئی۔ لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ صورت حال خود ہمارے ہی عدم احساس اور فقدان عمل کا نتیجہ ہے اور ہم خود براہ راست اس کے ذمہ دار ہیں۔ ہم نے واقعات عالم کے سیل رواں کو اپنے خون کے دھاروں سے بارہا روک تو دیا ہے مگر کبھی اس کا خیال نہیں کیا کہ ہمارے لہو کی سرخی داستان تاریخ کا عنوان بھی بن جائے۔ وقت کے مورخ نے جب قلم ہاتھوں میں لیا تو ہم بے نیازی کے ساتھ گونگے ہو گئے اور وہ نہایت بے دردی سے یا تو ہمیں نظر انداز کر گیا یا ہمارے روشن ورنگین سوانح کو تاریک وداغدار بنا کر پیش کر گیا جس کی بنا پر دنیا ہمارے متعلق نہایت خطرناک قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہوگئی ہے۔ یہ ظالمانہ برتاؤ ہمارے ان کارناموں کے ساتھ کیا گیا جو دیگر فرق اسلامیہ کے ساتھ ایک مشترک حیثیت رکھتے تھے مگر عزاداری جو خالصاً ہمارا قومی وطیرہ اور مذہبی فریضہ ہے اور جسے ہم شہادت کے بعد سے تا ایندم ایک عملی احتجاج کی حیثیت سے ہر سال محرم کے دنوں میں قائم کئے ہوئے ہیں اسے تاریخ عالم کوئی مقام کیوں دینے لگی۔

ایک غور طلب بات

محرم کے دن قریب آتے ہی اشتہار وپوسٹر شائع ہونے لگتے ہیں۔ تقریر وتحریر کے ذریعہ عوام کو یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ عزاداری بدعت ہے، عزاداری حرام ہے، میں پوچھتا ہوں کہ دنیا کی واقعی کتنی فضول وبیکار رسمیں ہیں، کتنے لغو لاطائل کام ہیں جنھیں انسان شب وروز کرتا رہتا ہے مگر کبھی کسی مصلح یا درد اسلامی رکھنے والے کو ان کے خلاف آوازۂ جہاد بلند کرنے کی توفیق نہیں ہوتی اور اب تو بعض واقعی غیر اسلامی امور مثلاً بے پردگی، بے حیائی وغیرہ تو مسلمانوں کی معاشرت کا جزو بن رہے ہیں اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ لیکن یہ زمانہ آتے ہی حمیت اسلامی کی رگ پھڑکنے لگتی ہے اور سارا ساز عمل بجنے لگتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اسی سے اندازہ کیجئے کہ یہ عزاداری محض چند رسوم کے بجالانے کا نام نہیں ہے بلکہ خیر وشر کی ایک مسلسل پکار ہے اور حق وصداقت کی متواتر ایک للکار ہے جسے مادیت کے نشہ میں چور ومدہوش دنیا کو ہر سال سنا کر ہوش میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موافقین سے زیادہ مخالفین اس کی اہمیت کا احساس رکھتے ہیں اور اس آواز حق کو ہر قیمت پر دبانے کی سعی لاحاصل میں مصروف رہتے ہیں۔

ہم اور ہمارے اسلاف

ہمارے اسلاف نے اس قیام عزاداری میں جانی ومالی قربانیاں دی ہیں، اپنی ہڈیوں کی اساس پر اپنے خون کے گارے سے اس تعمیر کو بلند کیا ہے۔ دنیا کے بدلے ہوئے حالات اب ان قربانیوں کے ہم سے طلبگار نہیں ہیں اب آزادی فکر وحریت عمل کے معقول دائرے قائم ہو چکے ہیں لیکن کیا یہ بھی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ ہم اسلاف کی ان جاں کاہیوں کو قلم بند کر کے دنیا کی تاریخ کے حوالہ کر دیں۔

اس سے بیک وقت ہمیں دو فائدے حاصل ہوں گے ایک تو اہمیت عزا کے سلسلہ میں قوم کا مستقل کردار سامنے آجائے گا جس سے پوری قومی سیرت پر روشنی پڑ سکے گی۔ اور دوسرے ہم اپنے اسلاف اور ان کے کارناموں کو گئے ہوئے وقت سے چھین چھین کر ایک نئی زندگی بخشیں گے اور اس طرح اپنی سعادت مندی اور دیانت پسندی کا ثبوت فراہم کریں گے۔

محرم کے دنوں میں اگر آپ اس فریضہ کی طرف متوجہ ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ یہ کام کافی حد تک اسی سال انجام پا جائے گا۔ ہمارے علماء وواعظین اگر اس کی اہمیت کا احساس فرمائیں اور جن مقامات پر بسلسلۂ ذاکری تشریف لے جائیں وہاں کے حالات باخبر حضرات سے دریافت کر کے قلمبند کر لیں تو یہ کیا مشکل ہے۔

میں ایک نظری خاکہ اس سلسلہ میں پیش کر رہا ہوں۔ اس میں حسب ضرورت ترمیم واضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

(۱) بستی کا نام۔ مورث اعلیٰ کون تھے، کب آئے؟ اور کہاں سے آئے؟ عزاداری کب اور کس نے شروع کی؟

(۲) شیعہ اور غیر شیعہ حضرات کے امام باڑے۔

(۳) شیعہ وغیر شیعہ مقرر، محدث، مجلس خوان، تحت اللفظ خوان، مرثیہ خوان، نوحہ خوان وغیرہ

(۴) شیعہ وغیر شیعہ اہل قلم، ادیب وشاعر جس نے واقعۂ کربلا پر کبھی کچھ لکھا ہو۔

(۵) مراسم عزا کے تدریجی دور۔ تبرکات اور شبیہوں کے تفاصیل فوٹو وغیرہ

(۶) شیعوں کی قومی، مذہبی، معاشرتی، اخلاقی، اصلاحی، اقتصادی اور سیاسی انجمنیں۔

ممکن ہے یہ بات ابھی کچھ لوگوں کی نظر میں اہمیت سے خالی ہو اور وہ آسانی کے ساتھ پروپیگنڈے کی مکروہ لفظ کے ساتھ مطعون کر دیں مگر ذرا غور تو کیجئے کہ آج جو نقوش آپ چھوڑ جائیں گے وہ سو دو سو پانچ سو اور ہزار برس بعد تاریخ کا کتنا قیمتی سرمایہ بنے گا اس کا صحیح اندازہ بھی اس وقت ہم نہیں کر سکتے۔ آج اس مشینی اور ایٹمی دور میں بھی جب ارتقائے انسانی کے نقطۂ آغاز کی تلاش کی جاتی ہے تو عہد عتیق کے اس حجری زمانہ سے بھی گذرنا پڑتا ہے جس کا تصور اس بیسویں صدی کے انسانوں کے لئے حددرجہ مضحک ہے مگر اہل فکر ونظر جانتے ہیں کہ اگر تہذیب انسانی کا یہ سرا نہ ملا ہوتا تو ارتقاء کی ساری صلاحیتیں آج تک سر بگریباں رہتیں۔ حجریات سے ایٹم بم تک ہماری مادی اور ظاہری زندگی کے پھلنے پھولنے کی کہانی ہے مگر واقعۂ کربلا اور اس کے تمام جزئیات ومظاہرات ہماری روحانی ومعنوی حیات کی ایک مسلسل داستان ہے جو اعلیٰ اخلاقی وانسانی اقدار کو اپنے اندر سموئے ہوئے وقت کے اتھاہ سمندر میں زمزمہ سنج ہے اور اسی طرح رہے گی حتی کہ ساحل مراد نظر آئے جہاں فرض شناس انسانیت پہنچ کر اپنے انعامات سے بہرہ مند ہو سکے۔　　(مورخہ محرم ۱۳۸۷ھ)

❁❁❁